خطباتِ اقبال کے اُردو تراجم: ایک جائزہ

محمد شعیب آفریدی

The Reconstruction of Religious Thought in Islam علامہ اقبال کے فکر و فلسفے کی ایک اہم کڑی ہے۔ ان خطبات کے ترجمے کا کام علامہ کی خواہش پر سید نذیر نیازی نے انجام دیا مگر علامہ اس ترجمے پر نظرِ ثانی نہ کر سکے۔ البتہ دوسرے خطبے کے ترجمے کو دیکھنے اور اس میں اصلاح کرنے کے بعد ضروری ہدایات کے مطابق ترجمے کا کام جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ سید نذیر نیازی کا یہ ترجمہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا اور برسوں متداول رہا۔ لیکن کچھ عرصہ قبل ماہرین زبان نے اس ترجمے کی نسبت زیادہ سہل اور رواں ترجمے کے دعوے کے ساتھ اپنے تراجم پیش کیے۔ اُردو کے چار اور عربی، فارسی اور پنجابی کا ایک ایک ترجمہ اب تک سامنے آ چکا ہے۔ ان اُردو تراجم کے ایک سرسری جائزے کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ تراجم بعض مقامات پر بہتر تفہیم اور مدّعا ے مخاطِب کو عام فہم بنانے میں تو ضرور کامیاب ہوئے ہیں مگر ان میں سے کسی ترجمے کو بھی یہ مقام نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سید نذیر نیازی کے ترجمے کی جگہ لے سکے۔ کئی مقامات پر تو ان مترجمین سے فہم کو بہتر بنانے کی بجائے بات بگڑ گئی ہے۔ اس جائزے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید نذیر نیازی کا ترجمہ مشکل اصطلاحات کے استعمال اور اسلوب کے پرانا ہو جانے کے باوجود آج بھی ایک منفرد علمی شان اور مقام رکھتا ہے۔ تاہم یہ ضرورت باقی ہے کہ اس کو سہل اور وقت کے جدید اسلوب کے اہم آہنگ بنایا جائے۔ اور ان مقامات کو واضح کیا جائے جہاں سید صاحب کا ترجمہ مبہم ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد اپنے ایک مضمون ''میراجی کے چند منظوم تراجم'' میں لکھتے ہیں:[1]

ترجمہ بجائے خود ایک مشکل فن ہے۔ اس میں کامیابی کی جو دو تین شرائط ہیں ان میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ مترجم صاحبِ ذوق اور دونوں زبانوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔ یوں ترجمہ کرنے کو جیسا آپ چاہیں کر لیں۔ لیکن ایک زبان کے فنکار کی روح کو دوسری زبان میں اُسی طرح داخل کرنا کہ ترجمے پر تصنیف کا گماں ہو، بہت کم اہلِ قلم کو ارزانی ہوا ہے۔

یہ تو عام کتب کے تراجم کی بات ہے۔ لیکن معاملہ جب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ جیسی دقیق اور عسیر الفہم کتاب کا ہو تو اس کی تسہیل اور ترجمے کی سلاست اور بھی ضروری ہو جاتی ہے اور اگر ترجمہ

ایسی زبان میں کیا جائے جس میں فکری اور فلسفیانہ مضامین کو سہارنے کی روایت پہلے ہی مسدود ہو چکی ہو تو ترجمے کا کام دشوار تر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اس اصول کی اہمیت کو جانتے تھے لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ ان کے خطبات کو تراجم کے ذریعے عام پڑھے لکھے مسلمان تک پہنچایا جائے۔ اس کے باوجود کہ انھیں خدشہ لاحق تھا کہ اُردو خواں طبقہ اس سے استفادہ نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ میر غلام بھیک نیرنگ کو انھوں نے ایک خط کے ذریعے اپنے خدشے سے آگاہ کیا۔[۲]

اُن کی خواہش تھی کہ ان کے خیالات روایتی علما اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں تک اس طریقے سے پہنچیں کہ انھیں سمجھنے میں دقت یا دشواری نہ ہو۔ اس غرض سے انھوں نے سیّد نذیر نیازی کو جو ہدایات دیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- ترجمے کی زبان آسان ہونی چاہیے اور مشکل اصطلاحات اور ادق اسلوبِ بیان سے پرہیز کیا جائے۔

۲- ترجمے کے بعض اجزا علماے دین کی نظر سے گزرنے چاہییں۔ چنانچہ سیّد نذیر نیازی نے خطبات کے مباحث اور مصطلحات کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سیّد عابد حسین، مولانا اسلم جیراج پوری اور مولانا محمد السورتی جیسے علما و فضلا سے مشاورت کی۔[۳]

۳- خطبات کے وہ مقامات جہاں بحث میں صرف اشارات ملتے ہیں۔ ان کی تھوڑی بہت وضاحت اس غرض سے کر دی جائے کہ ان کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس طرح وہ عبارت جس کا ترجمہ بسببِ ایجازِ کلام، فلسفیانہ اصطلاحات اور علمی افکار کی بحث میں کسی قدر مغلق یا عسیر الفہم نظر آئے اسے کھول دیا جائے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کی اس خواہش سے مقصود اُردو دان طبقے کو ان مباحث سے روشناس کرانا تھا جو کہ دنیا کی متداول فکر سے شناسائی کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ اس امر کے امکانات کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ انھیں احساس تھا کہ ان کے مباحث چیدہ چیدہ لوگوں کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جن کی ذہنی اور فکری تربیت ایک خاص نہج پر ہو چکی ہے۔ عام آدمی تو ان موضوعات سے ہی متعارف نہیں، کجا وہ مقصد جو ان مباحث میں مضمر ہے اور اقبال کا مطمحِ نظر تھا۔ گویا ڈاکٹر محمد اقبال خطبات کو ترجمے کے ذریعہ عوام میں اس طور پر متعارف کروانا چاہتے تھے کہ ان کے مباحث علما اور عوامی حلقوں میں نفوذ کر جائیں اور وہ ان خطوط پر سوچنا شروع کریں۔

اس بات میں شک نہیں کہ خطبات کے براہِ راست مخاطب ایسے مسلمان اور غیر مسلم مفکرین اور متخصّصین تھے جو انگریزی زبان اور جدید فلسفیانہ مباحث و مسائل سے آگاہ تھے۔ لیکن اقبال وسیع تہذیبی اور ثقافتی سطح پر ان مباحث کو پھیلانا چاہتے تھے اور یہ کام ترجمے ہی کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ سیّد نذیر نیازی

کے مطابق خطبات کے اُردو ترجمے کا خیال ڈاکٹر محمد اقبال کے ذہن میں ابتدا ہی سے موجود تھا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر عابد حسین (استاد فلسفہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں مگر ان کی معذرت پر نیازی صاحب نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں سیّد نذیر نیازی نے دوسرے خطبے کے کچھ اجزا کا ترجمہ کیا۔[۴] علامہ اقبال نے اس ترجمے میں الفاظ اور مصطلحات حتیٰ کہ عبارتوں تک کی اصلاح کی اور انھیں ترجمہ جاری رکھنے کا حکم دیا۔ سیّد نذیر نیازی نے اپنے ترجمے میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ترجمہ انگریزی زبان اور جدید فلسفہ سے ناآشنا حضرات کے لیے دشوار نہ ہو۔ اور جدید فلسفیانہ افکار کی ترجمانی جن انگریزی الفاظ و مصطلحات میں کی گئی ہے ان کو ایسے اُردو الفاظ و مصطلحات میں بیان کیا جائے جو مغربی فلسفہ سے ناواقف حضرات کے لیے اجنبی اور نامانوس نہ ہوں۔ اس کے باوجود ناقدین نے اس ترجمہ کو دقیق اور مشکل قرار دیا ہے۔

کنیز فاطمہ یوسف اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:[۵]

> وہ ایسی جناتی زبان میں تھا جس کے مقابلے میں انگریزی کہیں زیادہ سہل اور مؤثر نظر آتی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ مترجم نے اقبال کے انقلابی تصورات میں کانٹ چھانٹ اور تردید و تاویل کا حق بھی خدا جانے کہاں سے حاصل کرلیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو میں ان خطبات کا جو ترجمہ دستیاب ہے وہ نہ صرف پیچیدہ اور مبہم ہے بلکہ گمراہ کن حد تک اصل سے مختلف بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد سمیع الحق لکھتے ہیں:[۶] ''ترجمہ مذکور کو بالاستیعاب پڑھا۔ انگریزی لفظوں کو خود ساختہ عربی میں ترجمہ کرکے بوجھل بنایا گیا ہے۔''

عامر سہیل اپنے مضمون ''خطبات اقبال کا پہلا اُردو ترجمہ- ایک تجزیہ'' میں لکھتے ہیں:[۷]

> علم فلسفہ سے گہرا تعلق رکھنے والے حضرات اوّل تو ان خطبات کا مطالعہ براہِ راست انگریزی ہی میں کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن مجبوراً اگر وہ اُردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں تو ادق اسلوبِ بیان اور عربی فارسی کی گنجلک اصطلاحات ان کا راستہ روک لیتی ہیں۔

ڈاکٹر وحید عشرت نے لکھا ہے:[۸]

> وہ عربی کے عالم تھے لہٰذا ترجمے میں عربی اصطلاحات ان کی مجبوری تھی۔ جس زمانے میں انھوں نے ترجمہ کیا اس زمانے میں اُردو زبان میں فلسفے کا کام ابھی ابتدائی مراحل میں تھا اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں تراجم ہو رہے تھے۔ لہٰذا ترجمے کی مشکلات سے وہ بھی دوچار تھے۔

مرحوم ڈاکٹر محمد افضل (سابق ریکٹر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد) کے خیال میں یہ ترجمہ عربی و فارسی تراکیب سے گراں بار ہونے کے باعث عام قاری کے لیے وجہ کشش نہیں۔[۹]

شریف کنجاہی لکھتے ہیں:[۱۰]

اب کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں سے بمشکل ایک فیصد ایسے ہوتے ہیں جن کا ان تہذیبی اور دینی زبانوں (عربی، فارسی) سے نصابی تعلق رہا ہوتا ہے۔ اس لیے سیّد صاحب کا ترجمہ آج کل مشکل اور گنجلک لگتا ہے۔

درج بالا تمام اقتباسات میں مشترک اعتراض سیّد نذیر نیازی کے ترجمہ میں عربی و فارسی مصطلحات کا بے دریغ استعمال ہے جبکہ ہمارے نزدیک عربی اور فارسی مصطلحات کا استعمال زیر بحث ترجمہ کا سقم نہیں اور نہ اس سے ترجمہ گنجلک یا ادق بنتا ہے۔ سیّد نذیر نیازی کا مقصد بھی اس ترجمہ کو چیستاں بنانا نہیں تھا جیسا کہ وہ خود تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:[۱۱]

مترجم کو بہرحال یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت علامہ کے ارشاد کے مطابق اس کا فرض تھا کہ خطبات میں جہاں کہیں جدید افکارِ فلسفہ کی ترجمانی جن الفاظ و مصطلحات میں کی گئی ہے ان کے لیے جو الفاظ، مصطلحات اور ترکیبات انتخاب کرے وہ انگریزی زبان اور مغربی فلسفہ سے ناواقف حضرات کے لیے غریب اور نامانوس نہ ہوں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیّد نذیر نیازی کے ترجمے کو کیوں گنجلک اور ادق کہا جا رہا ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل اُمور کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

۱- یہ ایک ایسی کتاب کا ترجمہ ہے جو بذاتِ خود بھی آسان نہیں ہے۔ یہ موضوعات عام لوگوں کے لیے مانوس نہیں۔ اِن موضوعات پر سوچنے اور انھیں سمجھنے کے لیے عام قاری کو فکری تربیت کے عمل سے گزرنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کے مخاطبین ایسے حضرات ہیں جو عہد جدید کے فکری مسائل سے آشنا ہیں اور اقبال متعدد مقامات پر اپنے مخاطبین کے علمی تبحر پر اعتماد کرتے ہوئے بات صرف اشارات میں کرتے ہیں۔ اقبال نے ایک مقام پر میر غلام بھیک نیرنگ کو لکھا:[۱۲]

میں خیال کرتا ہوں کہ اُردو خواں دنیا کو شاید ان (خطبات) سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کرلیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔

۲- سیّد نذیر نیازی کے ترجمہ کے معترضین کا تعلق زمانۂ حال سے ہے۔ گذشتہ پچاس سالوں میں زبان کے ڈھانچے اور اظہار کے کینڈے میں یقیناً بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ نسل جو عربی اور فارسی الفاظ سے مانوس تھی اور ان کے استعمال سے محظوظ ہوتی تھی، اب نہیں رہی۔ اس طرح عربی اور فارسی الفاظ یقیناً آج کے قارئین کے لیے نامانوس ہوسکتے ہیں۔

۳- جدید فکری مباحث کے لیے اُردو زبان کا دامن بہت محدود ہے اور یہ مشکل نہ صرف اُس وقت

کے لکھاریوں کو درپیش تھی بلکہ آج بھی بدستور موجود ہے۔ تاحال علمی اصطلاحات کا اجتماعی اور قابل قبول نظام وضع کرنے کے لیے اعلیٰ پائے کی اجتماعی کوشش نہیں ہوئی۔

درج بالا اُمور کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سیّد نذیر نیازی مجبور تھے کہ وہ انفرادی سطح پر الفاظ و اصطلاحات کا چناؤ کریں اور جہاں کہیں کوئی کمی یا مشکل ہو اسے تشریحی شذرات کی مدد سے واضح کر دیں۔ تشریحی شذرات کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ اُردو زبان میں کچھ الفاظ ایسے بھی مروّج ہیں جن کو اپنے اصل مفہوم یا مادے (root word) سے کوئی نسبت نہیں رہی۔ یہ کام سیّد نذیر نیازی کا نہیں تھا کہ اُردو میں ان الفاظ کے استعمال میں تبدیلی لاتے اور اس کو مروج کر دیتے۔ دوسرے یہ کہ وہ وضعِ اصطلاحات میں اناڑی نہ تھے۔ وہ وضعِ اصطلاحات یا واژہ سازی کے بنیادی اصولوں سے واقف تھے اور انھوں نے اپنے ترجمے میں اس امر کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ ایک مقام پر وہ خود لکھتے ہیں: [۱۳]

> وضع اصطلاحات میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح کے جو الفاظ اصطلاحاً استعمال ہو رہے ہیں ان کے اصطلاحی اور حقیقی مفہوم میں اس درجہ تفاوت نہ ہو کہ ہماری وضع کردہ اصطلاحات اور قدیم مصطلحات میں کوئی معنوی علاقہ باقی نہ رہے۔ یہی امر اِن جدید یا قدیم عربی اور فارسی مصطلحات کے انتخاب میں ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے جن کے استعمال پر ہم مجبور ہیں۔ ان اصطلاحات کا تعلق ایسے الفاظ سے نہیں ہونا چاہیے جن کے معنی ہماری زبان میں بالکل بدل چکے ہیں۔

سیّد نذیر نیازی نے دانستہ کچھ قدیم عربی اور فارسی مصطلحات کو اپنے ترجمہ میں منتخب کیا ہے۔ ان کا مقصد ان کی ازسرِنو ترویج ہے۔ یہی الفاظ و اصطلاحات ہمیں ہماری علمی اور فلسفیانہ روایت سے متعارف کرا کر ہمیں فکری طور پر اس سے مربوط کر سکتے ہیں۔ یہ اصطلاحات اگر آج مستعمل نہیں تو اس کی وجہ ہمارا زوالِ علم ہے۔ سیّد نذیر نیازی بعض نئی اور معروف اصطلاحات سے متفق نہیں اور ان میں ترمیم اور نظرِ ثانی بلکہ تبدیلی کی سفارش کرتے ہیں۔ سیّد نذیر نیازی کے ترجمے میں اصطلاحات کے استعمال کا طریقہ ملاحظہ کیجیے:

نیازی صاحب نے (Paradoxes) کے لیے 'مغایرت' یا 'قول مغایر' کے الفاظ استعمال کرنے کی سفارش کی ہے جبکہ مولانا ظفر علی خان اس کے لیے مستبعد یا قولِ مستبعد کے الفاظ استعمال کر چکے تھے۔ یہاں لغوی اعتبار سے سیّد نذیر نیازی کا انتخاب بہتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ (Paradox) وہ قول ہوتا ہے جس میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہوتا۔

سیّد نذیر نیازی نے خطبۂ دوم کے کچھ حصوں کا ترجمہ اصلاح کی غرض سے علامہ اقبال کو دکھایا بھی تھا۔ علامہ نے کچھ الفاظ کی اصلاح کی تھی۔ مثلاً (Teleological) کا ترجمہ نیازی صاحب نے 'غایتی' لکھا تھا، علامہ نے کہا کہ ''غایتی'' کے بجائے ''غائی'' کیا جائے۔ اسی طرح (cosmological) اور (ontological) کو

سیّد نذیر نیازی نے بالترتیب 'کونیاتی' اور 'وجودیاتی' لکھا تھا۔ علامہ نے انھیں بدل دیا کیونکہ ان کے مطابق جہاں تک ممکن ہو ''یاتی'' کے استعمال سے احتراز بہتر ہے۔

سیّد نذیر نیازی کے نزدیک (Atom) کے لیے مناسب لفظ 'ذرہ' ہے اور (Atomic) کو 'ذریت' کہنا چاہیے اور اس مادہ (root word) سے متعدد مزید اصطلاحات وضع ہوسکتی ہیں۔ لیکن مشرقی علمی روایت کا لحاظ رکھتے ہوئے انھوں نے اس کے لیے 'جوہر' کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ ان معنوں میں 'جوہر' دراصل 'جوہر فرد' ہے۔ اس لیے کہ اشاعرہ کے نزدیک اس کا وجود مادی نہیں۔ وہ ایک غیر محسوس ہے اور اس کا سرچشمہ قدرت الٰہیہ ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ (Atomism) کو اگر 'جوہریت' کہا جائے تو (Atomicity) کو کیا کہا جائے گا، لہٰذا سیّد نذیر نیازی نے مجبوراً جواہریت لکھا ہے۔

(Intensity) کا لفظی ترجمہ تو شدت ہے لیکن اشارہ چونکہ حقیقت مطلقہ کی اندرونی لامتناہیت کی طرف ہے لہٰذا مترجم کو ادائے مطلب کے لیے 'افزونی' اور 'توسع' ایسے الفاظ کا سہارا لینا پڑا۔

اصطلاحاً (instant) کو 'آن' ہی کہنا چاہیے لیکن (point-instant) کو 'لمحہ-نقطہ' کہنا پڑا، اس لیے کہ 'آن-نقطہ' کی ترکیب بے جوڑ تھی۔ عربی میں مکان جیسی اصطلاح کے لیے ''ھنا'' کی اصطلاح موجود ہے جسے آج کل (point) کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ لہٰذا 'سلسلہ نقاط ولمحات' کو 'سلسلۂ آنات وھنات' بھی کہا جاسکتا ہے۔ مترجم نے بہرحال (point-instant) کو 'نقطہ-لمحہ' ہی کہا ہے۔

اسی طرح 'احساس' (feeling) کا مترادف ہے۔ 'جذبہ' (passion) اور 'عاطفہ' (emotion) کا لہٰذا (emotion) کو جذبہ کہنا ٹھیک نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اُردو میں 'عواطف' بمعنی (emotions) استعمال ہوتا ہے لیکن 'عاطفہ' بمعنی (emotion) استعمال نہیں ہوتا۔ اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ عربی الفاظ امیال و عواطف، احساسات وتاثرات اور جذبات جیسے دوسرے الفاظ کا استعمال علمی نقطۂ نظر سے کیسے متعین کیا جائے۔

الفاظ کی مندرجہ بالا مثالوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ الفاظ وتراکیب اور اصطلاحات کے چناؤ میں سیّد نذیر نیازی کا طریقہ مضبوط دلائل اور وجوہ کی بنیاد پر قائم ہے۔ انھوں نے الفاظ کے چناؤ میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اُردو میں مروّجہ اصطلاحات کے استعمال میں زبان کے اصول وضوابط متاثر نہ ہوں۔ عربی اور فارسی اصطلاحات کے استعمال میں بھی انھوں نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ جن اصطلاحات کا استعمال از بس ضروری ہے ان کا تعلق ایسے مادہ (root word) سے نہ ہو جن کے معنی ہماری زبان میں بالکل بدل چکے ہیں۔ ان کی وضع کردہ اصطلاحات میں یہ اصول ان کے پیش نظر رہا کہ اصطلاحی اور حقیقی مفہوم میں بہرحال معنوی تعلق باقی رہنا چاہیے۔ قدیم عربی اور فارسی مصطلحات کے

استعمال سے ان کا مقصد ایک تو ان کی ترویج تھا اور دوسرا اپنی مشرقی فکری وفلسفیانہ روایت سے عہد جدید کے قاری کا تعلق قائم کرنا۔ اُردو کی نئی اور معروف اصطلاحات میں ترمیم اور نظر ثانی دراصل ان میں وضاحت اور سلاست کی خاطر کی گئی ہے۔

گذشتہ صفحات میں سیّد نذیر نیازی کے ترجمہ پر وارد ہونے والے اعتراضات اور مضامین کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے کسی بھی مضمون نگار نے لغوی مباحث سے اپنے دعویٰ کا ثبوت مہیا نہیں کیا اور نہ الفاظ کا اپنا انتخاب ہی انھوں نے بطور نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے لکھنے کا انداز اتنا سرسری ہے کہ ہم ان اعتراضات کا لغوی اور لسانی تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں لہٰذا ان رواروی میں لکھے گئے مضامین کی روشنی میں سیّد نذیر نیازی کی اہم علمی کاوش کے بارے میں ہم کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے لیے یہ صورت اور بھی الجھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ متعدد نامور نقادوں اور اقبال شناس علما نے اس ترجمے کو سراہا ہے:

۱- ''سیّد نذیر نیازی مرحوم جو علامہ اقبال کے بڑے معتمد علیہ تھے اور جنھوں نے علامہ کے حکم سے اور ان کی نگرانی میں خطبات کا اُردو ترجمہ مع تشریحات وتعلیقات کے بڑی خوبی اور تحقیق وتدقیق سے کیا ہے''۔ (مولانا سعید احمد اکبر آبادی) [۱۴]

۲- ''سیّد نذیر نیازی نے عمدہ ترجمہ ہمیں دیا ہے''۔ (ڈاکٹر سیّد عبداللہ) [۱۵]

۳- ''نذیر نیازی نے ترجمہ بہت اچھا کیا ہے''۔ (آل احمد سرور) [۱۶]

۴- ''سیّد نذیر نیازی نے یہ کام جو بڑا مشکل تھا، بہ سہولت انجام دیا اور یہ کام ہی ان کی علمی فضیلت، درّاکی اور فلسفہ فہمی کے ثبوت کے لیے کافی ہے''۔ [۱۷]

۵- ''انھوں نے انگریزی خطبات کا جو ترجمہ کیا ہے وہ چھوٹا کام نہیں۔ جہاں تک اس ترجمہ کی صحت کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تو شبہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے بعض حصے علامہ اقبال نے دیکھے اور بعض ڈاکٹر عابد حسین نے''۔ [۱۸]

یہ توصیفی کلمات سیّد نذیر نیازی کے ترجمے کی اہمیت سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن اس ترجمے کو نقائص سے پاک نہیں کہا جاسکتا کیونکہ رفو کا بہت سا کام ابھی باقی ہے۔ کسی بھی علمی کتاب کے ترجمے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو زبان کی صرفی ونحوی تشکیلات اور محاورہ وغیرہ کا۔ دوسرا پہلو علمی اصطلاحات کا ہے۔ اوّل الذکر میں مترجم کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ بات کو سلیس اور عام فہم بنانے کے لیے جملے کی تشکیل جدید اور مروّجہ انداز میں کرے اور روزمرہ استعمال کی زبان کو وسیلۂ اظہار بنائے۔ لیکن اصطلاح سازی یا

واژہ سازی کی آزادی ہر لکھاری کو نہیں دی جاسکتی۔ مصطلحاتِ علمی کو اپنانا اور رواج دینا ایک شخص یا ایک نسل کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لیے علمی کلچر کی تشکیل اور فروغ ضروری ہے۔ اس کلچر کی تشکیل کے لیے پاکستان، ایران، مصر، ترکی، بھارت کے سکالر اور علما باہمی مشاورت سے ایک کمیٹی کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ باہم مشاورت سے مصطلحات کا ایک ایسا نظام وضع کریں جو تمام ممالک کے علما کے لیے قابل قبول ہو اور انھیں تمام یونی ورسٹیوں میں درسی کتب میں استعمال کر کے مروّج کیا جائے۔ یوں ایشیائی ممالک اپنے ماضی سے رشتہ قائم کر سکتے ہیں اور جدید عہد میں عملی سطح پر ابلاغ میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور علمی مباحث کے انعقاد اور ان کے استفہام کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ ذاتی سطح پر معروضی اصولوں کو بروئے کار لائے بغیر علمی اصطلاح سازی سے اجتناب کیا جائے۔ پاکستانی مصنّفین کی ایک بڑی کھیپ اصطلاحات کے استعمال میں محتاط نہیں۔ وہ زبان کے اصولوں کو جانے بغیر اپنے طور پر زبان کے کچے پکے علم کی مدد سے اصطلاحات اپنا لیتے ہیں۔ یہ کام ڈکشن کا نہیں ڈکشنری کا ہے اور اس میں خالصتاً معروضیت اور قطعیت لازمی ہے۔ یوں ایشیائی ممالک میں عمومی طور پر اور ہندوستان اور پاکستان میں خاص طور پر اصطلاحات کے حوالے سے بے شمار لکھنے والے قارئین کی پریشانی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر اگر ہم سیّد نذیر نیازی کے ترجمے کا موازنہ دوسرے تراجم سے کریں تو ہمیں سیّد نذیر نیازی کی اصطلاح سازی قدرے بہتر اور وقیع معلوم ہوتی ہے۔ تاہم جملوں کی ساخت اور انھیں جدید محاورے کے مطابق ڈھالنے کے حوالے سے اصلاح کی گنجایش موجود ہے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں مستعمل الفاظ و اصطلاحات کا اسلوب اب مروج نہیں اور عوامی ذوق پر گراں گزرتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ عربی اور فارسی کو اس طرح تعلیمی اداروں اور علمی حلقوں سے ختم کر دیا گیا ہے کہ اب کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والوں سے بمشکل ایک فیصد ایسے ہوں گے جن کا ذوق اب زبانوں کے فکر و ادب اور محاورہ کے مطابق تربیت یافتہ ہو۔ عربی فارسی تراکیب آمیز عبارت آرائی ایک مدت تک مسلمان اہل قلم کی شناخت رہی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور مولانا ظفر علی خان نے ایک نسل کے ذوق کی تربیت کی لیکن وہ نسل اب نہیں رہی لہٰذا اس امر میں کوئی قباحت نہیں کہ خطبات کے ایسے تراجم کیے جائیں جو اسلوب کے اعتبار سے جدید ذوق کی تشفی بھی کر سکیں اور عہد جدید کے عوام کے لیے قابل فہم بھی ہوں۔

اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ علامہ اقبال نے اس امر کی بالخصوص ہدایت فرمائی تھی کہ مترجم ہر ایسی عبارت کو جس کا ترجمہ بسبب ایجازِ کلام یا جدید فلسفیانہ اور علمی افکار کے بحث میں کسی قدر مغلق یا عسیر الفہم

نظر آئے بقدر ضرورت کھول کر ایک حد تک واضح الفاظ میں بیان کر دے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب اقبال کو دوسرے خطبے کے کچھ اجزا کا ترجمہ پیش کیا گیا تو انھوں نے بعض عبارتوں کی وضاحت فرمائی اور بعض میں ترمیم کر دی۔ لیکن یہ کام بوجہ علالت مکمل نہ کر سکے۔ ایزادات اور توضیحات بڑی ذمہ داری کا کام تھا اور اقبال کے ایما اور نظرِ ثانی ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ تاہم سیّد نذیر نیازی نے اس امر کے پیشِ نظر کہ بہر حال اقبال کی کچھ توضیحات تو موجود ہیں اور ان کا برقرار رکھنا بھی ضروری ہے یہی مناسب سمجھا کہ تمام توضیحات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لہٰذا ایک حصے کو بشکل تصریحات کتاب کے آخر میں درج کر دیا اور دوسرا مختصر صورت میں کتاب کے ذیل میں درج ہو گیا۔ علامہ اقبال کی جو توضیحات حواشی میں درج ہیں ان کی نوعیت ایسی ہے کہ اگر انھیں سیّد نذیر نیازی اپنے ترجمے کے متن ہی کے اندر قوسین میں درج کر دیتے تو بہتر ہوتا کیونکہ ان سے عبارت کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی حیثیت حواشی کے بجائے عبارت ہی کے ایک حصے یعنی ناتمام جملوں کی ہے جنھیں متن کے ساتھ ملا کر پڑھ لینے سے مدعا اور مفہوم کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

سیّد نذیر نیازی کا ترجمہ ۳۶ برس تک متداول اور رائج رہا۔ اس دوران اِکا دُکا خطبے کے ترجمے کی کوششیں ہوئیں۔ لیکن کوئی مکمل کاوش منظرِ عام پر نہ آ سکی۔ دوسرا مکمل ترجمہ جناب شریف کنجاہی کے قلم سے بہ عنوان مذہبی افکار کی تعمیرِ نو، بزمِ اقبال لاہور سے شائع ہوا۔ شریف کنجاہی کئی برس قبل خطبات کا پنجابی ترجمہ شائع کر چکے تھے۔[19] محترم شریف کنجاہی نے سیّد نذیر نیازی کے ترجمہ کو بنیاد بنایا ہے اور وضاحتی حواشی میں احمد آرام کے فارسی ترجمہ[20] اور عباس محمود کے عربی ترجمہ[21] سے استفادہ کیا ہے۔ شریف کنجاہی کے پیشِ نظر بھی یہ مقصد تھا کہ خطبات کو عام فہم زبان میں پیش کیا جائے تاہم اصطلاحات کے انتخاب میں کسی زبان کے اصول کے نظام کو قبول کرنے کی بجائے انھوں نے خاصی آزادی برتی ہے جس سے اختلاف کی کافی گنجایش ہے۔ مترجم کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہ خطبات کو عام فہم زبان میں ڈھالنا وقت کی ضرورت ہے اس دعویٰ کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا کہ وہ واقعی اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے تو یہاں تک جرأت کر لی کہ وہ اصطلاحات جن کے اُردو مترادفات اقبال نے خود متعین کیے، انھیں بھی بدل دیا۔

ہمارے خیال میں اقبال نے جو اُردو مترادفات متعین کر دیے تھے انھیں جوں کا توں رکھنا چاہیے تھا۔ تاہم ایک دو مقامات ایسے ہیں جہاں شریف کنجاہی نے اپنی صوابدید کا بہتر استعمال کیا ہے جو عام قاری پر بات کو بہتر طور پر واضح کرتا ہے۔ انھوں نے احمد آرام کے فارسی ترجمہ اور عباس محمود کے عربی ترجمہ کو بنیاد

بنایا ہے لیکن کچھ اصطلاحات میں انھوں نے اپنا راستہ الگ کرلیا ہے اور بعض مقامات پر اصطلاحات کے استعمال کی بجائے پیرایۂ اظہار کو بدل کر مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ یوں وہ مروّجہ ترجمہ کے طریقوں سے ہٹ گئے ہیں لیکن بات کا ابلاغ بہتر ہوگیا ہے۔

اب ہم خطبات کے چند مقامات کے تراجم سے اپنے درج بالا موقف کی وضاحت کرتے ہیں۔

خطبہ اوّل میں ایک مقام پر اقبال لکھتے ہیں:[۲۲]

> Ibn Khaldun, who approached the content of mystic consiousness in a more critical spirit and very nearly reached the modern hypothesis of subliminal selves.

کنجاہی صاحب کا ترجمہ یوں ہے:[۲۳]

> ابن خلدون نے عرفانی شعور کے مافیہ کی طرف زیادہ تنقیدی جذبے کے ساتھ نگاہ ڈالی اور نیم آگاہ نفوس یا شعور خفی کے مفروضے کے قریب جا پہنچا۔

اس اقتباس میں (Subliminal selves) علم نفسیات کی اصطلاح ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی مترجم نے ''خود آگاہی باطنی''[۲۴] اور عربی مترجم نے ''**عن العقل فیما وراء الشعور**''[۲۵] کے الفاظ سے کیا ہے۔ سیّد نذیر نیازی نے ''نفوس تحت الشعور'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔[۲۶] یہ تمام تراکیب اس اصطلاح کے مفہوم کو قطعی طور پر واضح نہیں کرتیں۔ اس اصطلاحی ترکیب سے مراد اصل میں وہ تحت الشعوری ذہن ہے جس کی سرگرمی کا عالمِ بیداری میں ادراک نہیں ہوتا۔ اس سے باطنی تجربہ کا وہ حلقہ بھی مراد ہے جو وصالِ الٰہی کا باعث بنتا ہے۔ ہمیں شریف کنجاہی کا ترجمہ زیادہ واضح اور بہتر معلوم ہوا ہے۔ انھوں نے 'شعور خفی' اور 'نیم آگاہ نفوس' کی اصطلاحات کے ذریعے قدرے قطعیت کے ساتھ اس اصطلاح کا مفہوم واضح کیا ہے۔ آج کل اس اصطلاح کے لیے ''ذاتِ کشفی'' کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

خطبات کے دیباچے میں اقبال کہتے ہیں:[۲۷]

> There are however, men to whom it is not possible organically to assimilate an alien universe by re-living, as a vital process, that special type of inner experience on which religious faith ultimately rests.

لیکن اس قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک یہ مزاجاً ممکن نہیں ہے کہ جس مخصوص قسم کے داخلی تجربے پر مذہبی ایمان استوار ہوتا ہے اس کا وہ کسی بنیادی لہر کے روپ میں تصور کرسکیں جس کا زندگی سے تعلق ہو اور جس کے ذریعے اس بظاہر غیر سی لگتی کائنات کی غیریت کو دور کیا جاسکے۔[۲۸]

(alien universe) کو اُردو اور فارسی میں 'جہانِ بیگانہ' کہا جاتا ہے جبکہ فلسفہ میں جہانِ محسوس کو (alienation spirit) بھی کہا جاتا ہے اور (alienation) سے کسی مظہر یا مظاہر میں ایسی تبدیلی مراد لی جاتی ہے جس سے وہ بذاتِ خود جو ہے اس سے مختلف بن جائے یا بنا دی جائے، جیسے روح سے مادہ۔ شریف

کنجاہی کے نزدیک اس ترکیب سے علامہ کی مراد ایسی کائنات ہے جو ہر چند مادی لگتی ہے لیکن اصل میں روح ہے، لہٰذا دیے گئے اقتباس کے ترجمے سے شریف کنجاہی کی علمِ فلسفہ کے بارے میں درّاکی کا سراغ ملتا ہے۔

شریف کنجاہی نے اپنے ترجمے میں متعدد مقامات پر اقبال کے روئے سخن اور عبارت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے عام لغات سے ہٹ کر ترجمہ کیا ہے مثلاً (idea) کا ترجمہ اُردو فارسی اور عربی میں فکر، اندیشہ وغیرہ ہوتا ہے لیکن خطبات کے دیباچے میں انھوں نے (idea) کا ترجمہ 'معقول' کیا ہے۔ اسی طرح (deed) کا ترجمہ عام طور پر 'عمل' کیا جاتا ہے لیکن شریف کنجاہی نے اسے ''محسوس'' لکھا ہے۔ یہ فنِ واژہ سازی کے اصولوں سے بظاہر انحراف ہے لیکن یہاں انھوں نے فلسفہ کی اصطلاح کے طور پر لیا ہے اور یہ افلاطون اور ہیگل کے فلسفوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ پیامِ مشرق میں ہیگل کے حوالے سے علامہ اقبال نے یہی اصطلاحات استعمال کی ہیں: ''حکمتش معقول و با محسوس درخلوت نہ رفت۔''[۲۹]

اسی طرح شریف کنجاہی نے ترجمہ میں ایک مقام پر (ideal) کے لیے 'مقصود' اور (real) کے لیے 'موجود' لکھا ہے۔

کچھ مقامات پر شریف کنجاہی نے اپنے فلسفہ کے علم کو بروے کار لاتے ہوئے براہِ راست اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی بجائے پیرایۂ اظہار کو بدل کر اس طرح بیان کیا ہے کہ بات واضح ہوگئی مثلاً خطبۂ سوم میں ایک مقام پر اقبال یوں کہتے ہیں:[۳۰]

> The more important regions of experience, examined with an eye on a synthetic view, reveal, as the ultimate ground of all experience, a rationally directed creative will which we have found reasons to describe as an ego.

> دریابی کے زیادہ اہم پہلوؤں کی طرف جب ہم اس چیز کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دھیان دیتے ہیں کہ آیا اس کی تصدیق واقعاتی علم سے بھی ہوتی ہے یا نہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی دریابی کی اصل ایک ایسی تخلیقی مشیت ہے جس کی کارروائیوں میں عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے اور جسے ہم نے بجا طور پر ایگو کا نام دیا ہے۔[۳۱]

اس اقتباس میں (synthetic view) کے لیے کوئی اصطلاح استعمال کیے بغیر پیرایۂ اظہار کی تبدیلی کی مدد سے شریف کنجاہی نے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ انگریزی کی اس ترکیب کے لیے عربی مترجم نے 'نظیرۃ شاملۃ' اور فارسی مترجم نے 'نظری ترکیبی' کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو کہ اس اصطلاح کا مفہوم کما حقہ بیان نہیں کرتیں بلکہ پریشان فکری میں اضافہ کرتی ہیں۔ اُردو مترجمین نے اس کا اظہار یوں کیا ہے: ''اس خیال سے کہ ان کا سلسلہ ایک دوسرے سے جوڑ دیں''..... یہ ایک غیر واضح بات ہے اور اقبال کے مدعا کو بیان نہیں کرتی۔ (synthetic view) علم منطق کی اصطلاح ہے اس سے مراد وہ طرزِ استدلال ہے جس میں صداقت کا معیار محض اصول نہیں بلکہ اس میں واقعات کی تصدیق بھی ایک ضروری شرط ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباس میں بھی شریف کنجاہی نے علمی اصطلاح سازی کی بجائے پیرایۂ اظہار کی تبدیلی کے ذریعے اقبال کے مدعا کی وضاحت کی ہے:

We have a world of point-events with their primary interval-relations.[32]

''ہماری دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس میں ہونیوں کا مکانی حوالہ ہوتا ہے اور ان ہونیوں میں بنیادی طور پر فاصلوں کے ناتے ہوتے ہیں۔''[۳۳] (point event) کو نذیر نیازی نے 'نقاطِ لمحات' لکھا ہے۔ فارسی مترجم نے 'حوادث برساں نقطہ' اور عربی مترجم نے 'ذی حوادث' لکھا ہے۔ شریف کنجاہی کا طریقہ بہتر ہے۔ شریف کنجاہی نے کچھ اصطلاحات کے مترادفات بے جا طور پر روایت سے ہٹ کر استعمال کیے ہیں۔ مثلاً 'مذہبی واردات' یا 'مذہبی تجربہ' مقبول و معروف اصطلاحات ہیں ان کی بجائے ''کشفی دریابی'' اور فلسفیانہ پرکھ یا معیار کے لیے 'میزان عقل' صوتی اعتبار سے اچھوتے ضرور ہیں لیکن اس قسم کے انتخابات کا کوئی خاص لسانی جواز نہیں۔ خصوصاً اس وقت جب ان کے مترادفات موجود ہوں اور مقبول اور مروّج بھی ہو چکے ہوں۔

❁.....❁.....❁

اس کے بعد پاکستان سے شہزاد احمد نے خطبات کو جدید محاورہ اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ شہزاد احمد ملک کے معروف شاعر ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور میں مقیم ہوئے۔ نفسیات اور فلسفہ میں ایم اے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۸۷ء میں ترجمہ کی ابتدا کی اور ان کے بقول پانچ ماہ میں اسے مکمل کر لیا اور اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے نام سے علم و عرفان پبلشرز لاہور سے اس کو شائع کروایا۔ اس کے ابتدائیے میں وہ تحریر کرتے ہیں:[۳۴]

میں نے کوشش کی ہے کہ خطبات کا یہ ترجمہ عام فہم ہو۔ کئی مقامات پر میں نے اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے مطلب بیان کر دیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے سمجھ سکیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ مفہوم بگڑنے نہ پائے۔

جب اس ترجمے کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا تو اس میں بھی متعدد اسقام سامنے آئے۔ بعض مقامات پر لغات کی غلطیاں ہیں۔ کچھ مقامات پر عبارت کے مدعا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اور غیر معیاری ڈکشنریوں سے ترجمہ کرنے کی وجہ سے قاری کے گمراہ ہونے کا سامان پیدا ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر شہزاد احمد کا ترجمہ زبان کے مروّجہ محاورہ کے قریب ترین ہے اگر چند مقامات پر احتیاط برتی جاتی تو جدید ذوق کے لیے یہ بہترین ترجمہ ہوتا۔ انھوں نے خاص طور پر التزام رکھا ہے کہ زبان کی جدید صورتوں کی بروئے کار لایا جائے۔

شہزاد احمد نے اپنے ترجمہ کا جواز یہ مہیا کیا ہے کہ زبان ارتقا کے عمل سے گزر رہی ہے لہٰذا کتب کے تراجم کو جدید محاورے کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیل کر کے پیش ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود کہ وہ متعدد

مقامات پر اپنے اس مقصد میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں مگر کئی مقامات پر ان کا ترجمہ لاپروائی کا شکار ہو گیا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ شہزاد احمد اقبال کے مدعا کو نہیں سمجھ سکے۔ مثلاً خطبۂ اوّل میں وہ لکھتے ہیں:

''انتقادِ عقل محض نے انسان کی عقلی حدود کا اخفا کیا اور عقلیت پسندی کے تمام کارخانے کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا''۔[۳۵]

مجھے نہیں معلوم کہ (reveal) کا معنی 'اخفا' انھوں نے کس لغت سے لیا ہے۔ اقبال کا جملہ یوں ہے:[۳۶] "His cirtique of pure reason revealed the limitations of human reason and reduced the whole work of rationalists to a heap of ruins"

اسی طرح "Both seek visions of the same Reality which reveals itself to them in accordance with their function in life"[37] کا ترجمہ انھوں نے یوں کیا ہے ''دونوں ایک ہی حقیقت کے نظارے کے طلب گار ہیں جو ان پر اپنا اخفا ان کی زندگی کے مخصوص تفاعل کے اعتبار سے کرتی ہے''۔[۳۸]

درج بالا اقتباس میں بھی انھوں نے (reveal) کا ترجمہ 'اخفا' کیا ہے۔ شہزاد احمد جیسے پڑھے لکھے شخص سے اس طرح کی غلطیوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

خطبۂ اوّل میں ہی ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''یہ موضوع اور معروض کے مابین باریک فرق تھا، جو ریاضیاتی تھا حیاتیاتی نہیں تھا مگر عیسائیت اس سے متاثر ہو گئی اسلام نے اختلاف کا مقابلہ اس پر غالب آنے کے ساتھ کیا''۔[۳۹]

اصل عبارت یوں ہے:[۴۰]

> It is the sharp opposition between the subject and the object, the mathematical without and the biological within, that impressed Christianity. Islam, however, faces the opposition with a view to overcome it.

یہاں (overcome) کا ترجمہ شہزاد احمد نے 'غالب آنا' کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دسترس میں کوئی غیر معیاری لغت ہے۔ اچھی لغت میں (overcome) کا معنی (solve) بھی ہوتا ہے اور یہی اقبال کا مدعا ہے۔

اسی طرح (mathematical without) اور (biological within) کا معنی صرف ریاضیاتی اور حیاتیاتی کرنا درست نہیں۔

اسی طرح:

> Classical physics has learned to criticize its own foundations As a result of this criticism the kind of materialism, which it originally necessitated, is rapidly

disappearing.[41]

''کلاسیکی طبیعیات نے اپنی ہی بنیادوں پر تنقید کرنا سیکھ لیا ہے جس کے نتیجے میں اس طرح کی مادیت جو پہلے اس نے رواج دی تھی اب تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔''[۴۲]

یہاں (originally necessitated) کا ترجمہ ''جو پہلے اُس نے رواج دی تھی'' کرنا لغوی اعتبار سے بھی درست نہیں اور اس سے عبارت کے مفہوم کا تقاضا بھی پورا نہیں ہوتا۔

ایک مقام کا ترجمہ کرتے ہیں:

ایمان پرندے کی طرح اپنا وہ بے نشان راستہ دیکھ لیتا ہے جسے خرد نے چھوا تک نہیں۔ ایک عظیم مسلم صوفی شاعر کے الفاظ میں ''وہ انسان کے زندہ دل پر گھات لگاتی ہے اور اس سے نظر نہ آنے والی زندگی کی وہ دولت چھین لیتی ہے جو اس کے باطن میں موجود ہوتی ہے۔'' اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ایمان محض احساس سے بڑی شے ہے۔ اس میں تفکرانہ مواد سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوتی ہے اس میں متکلمین اور صوفیا جیسے ایک دوسرے کے مخالف گروہ بھی موجود ہوتے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تاریخِ مذاہب میں خیالِ مذہب کا زندگی بخش عنصر ہے۔[۴۳]

علامہ کی عبارت ہے:

..... and faith, like the bird, sees its 'trackless way' unattended by intellect which, in the words of the great mystic poet of Islam, only waylays the living heart of man and robs it of the invisible wealth of life that lies within, Yet it cannot be denied that faith is more than mere feeling. It has somthing like a cognitive content and the existence of rival parties - scholastics and mystics -in the history of religion shows that idea is a vital element in religion."[44]

یہاں ''جسے خرد نے چھوا تک نہیں'' (unattended by intellect) بہتر ترجمہ ہے اور اصل کے قریب الفہم ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس بھی ہے لیکن (invisible wealth of life) کا ترجمہ نظر نہ آنے والی زندگی کی دولت یا دولتِ زندگی ہونا چاہیے۔ اسی طرح (cognitive content) کا ترجمہ ''تفکرانہ مواد'' اچھا ترجمہ نہیں۔

خطبہ اوّل میں "No one would hazard action on the basis of a doubtful principle of conduct."[۴۵] ''کوئی بھی شعار کے مشتبہ اصولوں کی بنیاد پر جی کڑا کر کے عمل کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔''[۴۶] کچا ترجمہ ہے۔

اسی خطبہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

Ghazali's philosophical scepticism which however, went a little too far, virtually did the same kind of work in the world of Islam.[47]

''غزالی کی فلسفیانہ تشکیک نے، جو کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی عملی طور پر عالم اسلام میں اسی طرح کا کام سرانجام دیا۔''[۴۸]

اس اقتباس میں (went a little too far) کا ترجمہ ''جو کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی'' چہ معنی دارد۔ اسی طرح خطبات کی عبارت:

> Islam fully agrees with this insight and supplements it by the further insight that the illumination of the new world thus revealed is not something foreign to the world of matter but permeates it through and through.[49]

کا ترجمہ: ''اسلام اس بصیرت سے مکمل اتفاق رکھتا ہے، بلکہ مزید بصیرت سے اس میں یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس طرح منکشف ہونے والی جو روشنی حاصل ہوتی ہے وہ مادی دنیا کے لیے کوئی اجنبی شے نہیں، بلکہ اس کی رگ و پے میں جاری وساری ہے''۔[۵۰] بہتر ترجمہ نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح:

> Such being the nature and promise of the universe, what is the nature of man whom it confronts on all sides?[51]

''سو یہ ہے ماہیت و پیمانِ کائنات، مگر انسان کی فطرت کیا ہے جسے یہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے''۔[۵۲] اس عبارت میں (promise) کا ترجمہ 'پیمان' کیا گیا ہے جو کہ اس کا لغوی معنی ہے۔ عبارت کے مفہوم اور سیاق کے اعتبار سے یہ ترجمہ درست نہیں۔

میں نے یہ تمام اقتباسات اقبال کے پہلے خطبے کے نصف اوّل کے تجزیے سے نکالے ہیں پوری کتاب کا تجزیہ کیا جائے تو شاید پوری کتاب بن جائے۔ اس تجزیے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مترجم نے سہل نگاری اختیار کرتے ہوئے عبارت کے مفہوم کا خیال نہیں رکھا اور نادانستہ طور پر خطبات کے سمجھنے میں نہ صرف دقت پیدا کر دی ہے بلکہ گمراہی کا خدشہ بھی لاحق ہے۔ یہ تو ترجمے کا ایک پہلو ہے۔ جس پہلو کی طرف میں خاص طور پر اشارہ کرنا چاہوں گا وہ قرآنی آیات کے حوالہ جات ہیں۔ اقبال نے خطبات میں قرآنی آیات کے لفظی تراجم کے حوالے سے بات نہیں کی بلکہ وہ اپنے مدعا کے لیے تفسیر یا تاویلات سے اخذ کردہ مفاہیم کو بروے کار لائے ہیں۔ شہزاد احمد نے متعلقہ آیات لکھ کر اُن کے مروّجہ تراجم لکھ دیے ہیں اور قاری کو یہ سمجھ نہیں آتی کہ یہ بات اقبال کی عبارت سے کیونکر متعلق ہے۔ یوں خطبات کی تفہیم میں دقت اور دشواری پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ کا ترجمہ شہزاد احمد نے لکھا ہے:[۵۳]

> ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اُٹھایا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

جبکہ اقبال کی عبارت یوں ہے:[۵۴]

> Verily we proposed to Heavens and to the earth and to the mountains to recieve the

trust (of personality), but they refused the burden and they feared to recieve it. Man alone undertook to bear it, but hath proved unjust, senseless.

اسی طرح سورۃ القیامۃ کی آیت ۴۰-۳۶ کا ترجمہ شہزاد احمد یوں کرتے ہیں:[۵۵]

کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے۔ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا۔ پھر اللہ نے اُس کا جسم بنالیا اور اس کے اعضا درست کیے اور پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے۔

جبکہ عبارت ہے:[۵۶]

Thinketh man that he shall be thrown away as an object of no use? Was he not a mere embryo? Then he became thick blood of which God formed him and fashioned him, and made him twain, male & female. Is not He powerful enough to quicken the dead?

ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی ذوق اور فکری تجسّس کی تشفی کے لیے ڈاکٹر محمد سمیع الحق نے خطبات کے ترجمے کا بیڑا اُٹھایا۔ وہ بھی نذیر نیازی کے ترجمے سے مطمئن نہیں اور اس کی وجہ وہ خود ساختہ عربی الفاظ کا استعمال بتاتے ہیں۔ اپنی کتاب تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر میں لکھتے ہیں:[۵۷]

انگریزی لفظوں کو خود ساختہ عربی میں ترجمہ کر کے بوجھل بنایا گیا ہے مثلاً (spontaneous) کے لیے ابدائی (Embrace) کے لیے اختوا (Categorical Impreative) کے لیے حکم قطعی (Vested interest) کے لیے حقوق مزعومہ وغیرہ جیسے الفاظ دیکھنے کو ملے۔ ایسا لگا جیسے کسی سازش کے تحت اُردو کو نامقبول بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

نذیر نیازی کے ترجمہ کے بارے میں ہم اپنا موقف وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سمیع الحق کے دعاوی ان کے اپنے ترجمے کے تنقیدی مطالعے سے کس قدر حق ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے نذیر نیازی کے ترجمہ سے مایوس ہو کر ۱۹۶۳ء میں کام کا آغاز کیا اور ۱۹۹۴ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی سے اسے شائع کروایا۔

انھوں نے آسان الفاظ کے استعمال کی پابندی کو قبول کیا ہے، لکھتے ہیں:[۵۸]

اُردو کے آسان سے آسان لفظوں کی تلاش ہی ایک مترجم کی پابندی ہے۔ ترجمہ کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہیے کہ ایک ترجمہ پڑھنے کے لیے کسی کو ایک اور زبان سیکھنی پڑے۔ وہ زبان جس کے الفاظ عوام کی دسترس سے باہر ہوں۔

سمیع الحق نے اپنے ترجمے کے دیباچہ میں آسان زبان کے استعمال پر بہت زور دیا لیکن اُن کے ترجمہ کے تنقیدی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ خود بھی اس ضمن میں کوئی زیادہ پیش رفت نہیں

کر سکے۔ متعدد مقامات پر انھوں نے نذیر نیازی کے الفاظ کے مترادفات لکھے ہیں لیکن وہ مترادفات بھی عام فہم نہیں۔ یوں انھوں نے بھی پیرایۂ اظہار بدل کر نئے مشکل عربی الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً قوی الحجت، نظامِ فکر وغیرہ۔

ڈاکٹر سمیع الحق کے ترجمے کا تنقیدی مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ موصوف نے نہ صرف یہ کہ اپنے دعوے کا عملی ثبوت مہیا نہیں کیا بلکہ کئی مقامات پر اصل متن کے مفہوم تک بھی قاری کی رہنمائی نہیں کر سکے۔ ہم اپنی بات کی وضاحت خطبات کی چند عبارتوں اور ان کے ترجمے سے کرتے ہیں:

..... and faith like the bird, sees its 'trackless way' unattended by intellect which, in the words of the great mystic poet of Islam, 'only waylays the living heart of man and robs it of the invisible wealth of life that lies within'. Yet it cannot be denied that faith is more than mear feeling. It has something like a cognitive content.[59]

ایمان کی مثال اس طائر کی سی ہے جو عقل کی مدد کے بغیر اپنی دشوار گذار راہوں کو دیکھ لیتا ہے۔ عقل کے متعلق ایک صوفی شاعر کا قول ہے کہ یہ آدمی کے قلبِ حیوان کو گمراہ کرتی اور اس کی غیر محسوس دولت حیات جو اس کے اندرون میں جاگزیں رہتی ہے لوٹ لیتی ہے۔ تاہم یہ ایک ناقابل انکار امر ہے کہ ایمان احساسِ محض سے بالاتر ہے اس میں کچھ ایسی باتیں موجود ہیں جو عقلی تجسّس کا سامان بن سکتی ہیں۔[۶۰]

یہ اقتباس اچھے ترجمے کی مثال نہیں مثلاً (trackless way) کا ترجمہ 'دشوار گذار' کیا گیا ہے۔ اسی طرح (cognitive content) کا معنی ''عقلی تجسّس'' بھی اچھا ترجمہ نہیں ہے۔

..... religion on its doctrinal side, as defined by Professor Whitehead, is a system of general truths.[61]

''پروفیسر وائٹ ہیڈ نے وضاحت کی ہے کہ مذہب کا جو روایتی پہلو ہے وہ حقائق عامہ کا ایک ایسا منظّم ضابطہ ہے۔''[۶۲]

(religion on its doctrinal side) کا معنی 'مذہب کا روایتی پہلو ہے' اچھا ترجمہ نہیں۔

"..... the general truth which it embodies must not remain unsettled".[63] ''وہ حقائق جو اس نظام کے اجزاے ترکیبی ہیں ان کو ہرگز غیر متعین حالت میں نہیں چھوڑا گیا ہوگا۔''[۶۴]

..... religion stands in greater need of a rational foundation of its ultimate principles than even the dogmas of science.[65]

''(مذہب کو) اپنے معیاری اصولوں کے لیے سائنسی دعاوی سے بھی زیادہ عقلی اساس کی ضرورت ہے۔''[۶۶] (ultimate principle) کے لیے 'معیاری اصول' اچھے ترجمے کی مثال نہیں۔

But to rationalize faith is not to admit the superiority of philosophy over religion.[67]

''لیکن دین کو دلیل سے پرکھنے کے یہ معنی نہیں کہ فلسفہ کو مذہب پر فوقیت حاصل ہے۔''[۶۸]

Thus, in the evalution of religion, philosophy must recognize the central position of religion and has no other alternative but to admit it as something focal in the process of reflective synthesis.[69]

پس مذہب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے وقت فلسفہ کو مذہب کی مرکزی حیثیت تسلیم کرنا پڑے گی اور فلسفہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے کہ مختلف روابط پر غور و خوض کے عمل میں مذہب کی مرکزیت کا اقرار کرے۔[۷۰]

اس اقتباس میں (reflective synthesis) کا معنی ''مختلف روابط پر غور وخوض'' اچھا ترجمہ نہیں ہے۔

Yet a careful study of the Qur'an and the various schools of scholastic theology that arose under the inspiration of Greek thought diclose the remarkable fact that while Greek philosophy very much broadened the outlook of Muslim thinkers, it on the whole obscured their vision of the Qur'an.[71]

تاریخ اسلام میں فلسفہ یونان کو ایک عظیم ثقافتی درجہ حاصل تھا، تاہم فلسفہ یونان سے متاثر ہوکر مسالک دینیہ کے جو مختلف مکاتب فکر عالم وجود میں آئے ان کے مطالعہ کے ساتھ قرآن مجید کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ اہم حقیقت کھل جاتی ہے کہ ایک طرف یونانی فلسفہ کی بدولت مفکرین اسلام کے مطمحِ نظر میں کافی وسعت ہوئی تو دوسری طرف بحیثیت مجموعی قرآن کے مطالعہ میں ان کی نگاہوں کو بصیرت نہیں مل سکی۔[۷۲]

(it on the whole obscured their vision of Qur'an) کا ترجمہ ''بحیثیت مجموعی قرآن مجید کے مطالعہ میں ان کی نگاہوں کو بصیرت نہیں مل سکی'' اچھے ترجمے کی مثال نہیں ہے۔

Thus the affirmation of spirit sought by christianity would come not by the renunciation of external forces which are already permeated by the illumination of spirit but by a proper adjustment of man's relation to these forces in view of the light received from the world within.[73]

پس عیسائیت کو جس روحانی انوار کی تلاش ہے وہ اس عالم خارجی سے قطع تعلق ہوکر ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کے رگ و پے میں پہلے ہی سے نورِ عرفان مسلک ہے۔ اس کا حصول تو تب ہی ممکن ہے جب مناسب ڈھنگ سے اس نورِ عرفان کی روشنی میں جو قلب پر منکشف ہوا ہے عالم خارجی سے انسانی رشتہ کا تعین کرلیا جائے۔[۷۴]

درج بالا اقتباس بیش تسہیلی کی مثال ہے اور اچھا ترجمہ نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ کئی مقامات پر انھوں نے غلط الفاظ استعمال کیے ہیں یہاں تک کہ اقبال کے مدعا سے دور جا پڑے ہیں اور نہ صرف قاری کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اُس کی گمراہی کے امکانات بھی پیدا ہوگئے ہیں، مثلاً اقبال نے انگریزی میں کہا ہے:

Yet it cannot be denied that faith is more than mere feeling. It has something like a cognitive content.[75]

اس اقتباس کا ترجمہ سمیع الحق نے یوں کیا ہے: ''تاہم یہ ایک ناقابل انکار امر ہے کہ ایمان احساس محض سے بالاتر ہے۔ اس میں کچھ ایسی باتیں موجود ہیں جو عقلی تجسّس کا سامان بن سکتی ہیں۔''[۶]

(cognitive content) کا معنی ''عقلی تجسّس'' اچھے ترجمے کی مثال نہیں۔

❁ ❁ ❁

خطبات کے تراجم میں ایک اہم کتاب وحید عشرت کی تجدید فکریات اسلام، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ پہلے خطبے کے ترجمہ کو اکادمی کی مجلس علمی کے ۲۴ ارکان کے سامنے اصلاح وتنقید کی خاطر پیش کیا گیا۔ اس مجلس میں ملک کے ممتاز ادیب، نقاد، انشاپرداز، مترجم اور شاعر شامل تھے۔ مجلس علمی کے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں اس پر غور ہوا۔ وحید عشرت کے بقول ''تمام حضرات نے اس ترجمہ کو سراہا۔ اسے سہل، مستند اور جدید اسلوب کا حامل قرار دیا۔''[۷] اس کے علاوہ مجلّہ اقبالیات میں اس کی اشاعت مکمل ہونے کے بعد یہ کام پروفیسر ڈاکٹر عبدالخالق کو نظر ثانی کے لیے پیش کیا گیا۔ ان تمام اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ توقع کرنا درست ہوگا کہ خطبات کا یہ ترجمہ مثالی ہوگا۔ لیکن اس ترجمے کا سرسری مطالعہ ہی قاری کو اس توقع کے برخلاف نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔ جملوں کی صرفی ونحوی ترکیب میں خامیاں، کتابت کی اغلاط اور بعض مقامات پر ڈھیلے ڈھالے جملوں کے باعث اسے مثالی ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم اس ترجمے کے چند اوصاف اسے دوسرے تراجم سے ممتاز کرتے ہیں۔ مترجم کے مطابق انھوں نے ترجمہ سے قبل خطبات سے متعلق لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا۔ جن میں ان سے قبل کے کیے گئے تراجم بھی شامل ہیں۔ فلسفیانہ اصطلاحات کے لیے قاموس الاصطلاحات اور فلسفے کی ڈکشنریوں سے بھی مدد لی گئی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی ترجمہ شدہ فلسفے کی کتب اور ان کے آخر میں دی گئی فرہنگوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ مشکل مقامات پر متن کا مفہوم مختلف پیرائے میں بیان کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ہر فقرے پر غور کیا گیا ہے کہ کہیں ترجمے میں وہ مہمل، بے معنی یا اصل متن سے ہٹ تو نہیں گیا، اور فقرہ بامعنی بھی ہے کہ نہیں۔ مترجم نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ اسلوب اس طرح کا ہو کہ یہ کتاب ترجمے کی کتاب نہ لگے بلکہ طبع زاد معلوم ہو۔ وحید عشرت کے مطابق:

> ترجمے کی زبان انتہائی سہل، رواں اور بوجھل اصطلاحات سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، صرف ناگزیر اصطلاحات کو ہی استعمال کیا گیا۔[۸]

خطبات کے کم وبیش سب مترجمین نے اصطلاحات سے اجتناب کو ایک مثبت قدر کے طور پر پیش کیا ہے، یہ ترجمہ کے معیار اور اقدار سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان سب مترجمین کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوچکی ہے کہ بہتر ترجمہ وہی ہے جس میں اصطلاحات استعمال نہ ہوں یا یہ کہ

اصطلاحات کا استعمال کم سے کم کیا جائے۔ گویا اس وصف کا موجود ہونا ترجمے کے بہتر نہ ہونے کی دلیل ہے۔ دراصل ایک معیاری ترجمہ وہی ہے جو اصل متن کے مدعا کو ہو بہو ادا کرے اور اس طرح کہ متن سے لغوی اور محاورے کے اعتبار سے بُعد یا دوری پیدا نہ ہو۔ اصطلاحات کا مناسب استعمال کسی بھی تحریر کی قطعیت میں اضافہ کرتا ہے۔ بلکہ اصطلاح سازی ایک فن ہے جو کسی زبان کے علمی ذخیرے میں نشوارتقا کا سبب بنتا ہے۔ دقت اور ابہام اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مترجم یا لکھاری متعلقہ دو زبانوں میں کسی ایک پر حسبِ ضرورت دسترس نہ رکھتا ہو۔ ترجمے میں اصطلاحات سے شعوری اجتناب مترجم کا منصب نہیں۔ کیونکہ متن کی بیش تسہیلی ترجمے کے اسقام کا سبب بن جاتی ہے۔

تجدیدِ فکریاتِ اسلام میں چند ایسے مقامات کا کامیاب ترجمہ کیا گیا ہے جو دوسرے مترجمین نے مشکل سمجھ کر یا تو بالکل نظر انداز کر دیے ہیں یا اپنے الفاظ میں انھیں بیان تو کیا ہے مگر بات کھل نہیں سکی۔ ڈاکٹر وحید عشرت نے اس حوالے سے ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے لیکن چند مقامات پر اُن سے بھی بات نہیں بن سکی۔ اب ہم تجدید فکریاتِ اسلام سے چند اقتباس لے کر اپنی بات کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔

> The essence of religion, on the other hand is faith; and faith like the bird, sees its 'trackless way' unattended by intellect which, in the words of the great mystic poet of Islam, 'only waylays the living heart of man and robs it of the invisible wealth of life that lies within. [79]

دوسری طرف مذہب کا جوہر ایمان ہے اور ایمان اس پرندے کی مانند ہے جو اپنا انجانا راستہ عقل کی مدد کے بغیر پالیتا ہے۔ اسلام کے ایک بہت بڑے صوفی کے الفاظ میں عقل تو انسان کے دلِ زندہ میں گھات لگائے رہتی ہے تاکہ وہ زندگی کی اس اَن دیکھی دولت کو لوٹ لے جو اس کے اندر ودیعت کی گئی ہے۔[۸۰]

اس اقتباس میں "trackless way" کا معنی ''انجانا راستہ'' بہتر ترجمے کی مثال ہے۔ اسی طرح

> In its attitude towards the Ultimate Reality it is opposed to the limitations of man, it enlarges his claims and holds out the prospect of nothing less than a direct vision of Reality.[81]

حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں اس کا اندازِ نظر انسانی تحدیدات سے ترفع کرتے ہوئے حقیقتِ مطلقہ کے براہِ راست مشاہدے تک اپنے دعوؤں کو بڑھاتا ہے۔[۸۲]

یہ اقتباس ایک عمدہ ترجمے کی مثال ہے۔ اس طرح کے متعدد مقامات ہیں جہاں وحید عشرت نے جملوں کی ترکیب عمدہ رکھی ہے۔ لیکن ایسی کئی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جہاں جملوں کا معیار برقرار نہیں رہتا۔ مثلاً:

> Its function is to trace the uncritical assumptions of human thought to their hiding places, and in this pursuit it may finally end in denial or a frank admission of the incapacity of pure reason to reach the Ultimate Reality.[83]

یہ اس کا وظیفہ ہے کہ وہ انسانی فکر کے بلاتنقید قبول کیے گئے مفروضات کے چھپے ہوئے گوشوں کا سراغ

لگائے۔ اس تجسس کا بالآخر انجام چاہے انکار میں ہو یا اس برملا اعتراف میں کہ عقلِ خالص کی حقیقتِ مطلقہ تک رسائی ممکن نہیں۔[۸۴]

❁.....❁.....❁

حوالے وحواشی

۱- مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ترجمے کا فن ،مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۲۔
۲- علامہ محمد اقبال، مکتوب بنام غلام بھیک نیرنگ مشمولہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۷۔
۳- سید نذیر نیازی، دیباچہ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۷ء۔
۴- ایضاً
۵- رفیع الدین ہاشمی، ''علامہ اقبال کے انگریزی خطبات''، مشمولہ اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، جنوری-مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۔
۶- محمد سمیع الحق، ڈاکٹر، دیباچہ تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۴ء۔
۷- عامر سہیل، ''خطباتِ اقبال کا پہلا اُردو ترجمہ- ایک تجزیہ''، مشمولہ فنون، لاہور، ۲۰۰۱ء، شمارہ ۱۱۲، ص ۸۵۔
۸- وحید عشرت، ڈاکٹر، عرضِ مترجم تجدید فکریاتِ اسلام، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۳۷۔
۹- شریف کنجاہی، دیباچہ، مذہبی افکار کی تعمیر نو، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۹۲، ص ۷۔
۱۰- ایضاً
۱۱- دیباچہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔
۱۲- علامہ محمد اقبال، مکتوب بنام غلام بھیک نیرنگ مشمولہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۷۔
۱۳- سید نذیر نیازی، دیباچہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔
۱۴-۱۸ رفیع الدین ہاشمی، محولہ بالا۔
۱۹- شریف کنجاہی، دیباچہ مذہبی افکار کی تعمیر نو۔
۲۰- خطبات کا فارسی ترجمہ از احمد آرام احیاے فکر دینی در اسلام کے نام سے ۱۹۶۸ء میں ریجنل کلچرل انسٹی ٹیوٹ طہران سے شائع ہوا۔
۲۱- خطبات کا عربی ترجمہ از عباس محمود تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام کے نام سے دارالہدایۃ مصر کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں سفارت خانہ پاکستان کے لیے شائع کیا گیا۔

22- Allama Muhammad Iqbal: *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Iqbal Academy, Lahore, 1989, p. 14.

۲۳- مذہبی افکار کی تعمیر نو، ص۳۰۔

۲۴- احیائے فکر دینی در اسلام، ص۲۲۔

۲۵- تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام، ص۲۷۔

۲۶- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص۵۵۔

27- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. xxii.

۲۸- مذہبی افکار کی تعمیر نو، ص۹۔

۲۹- علامہ محمد اقبال، ''پیامِ مشرق'' کلیاتِ اقبال (فارسی)، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۳۷۷۔

30- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 50.

۳۱- مذہبی افکار کی تعمیر نو، ص۷۹۔

32- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 53.

۳۳- مذہبی افکار کی تعمیر نو، ص۸۲۔

۳۴- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۱۱۔

۳۵- ایضاً، ص۲۱۔

36- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 4.

37- ibid, p. 2.

۳۸- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۱۹۔

۳۹- ایضاً، ص۲۵۔

40- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 7.

41- ibid, p. xxii.

۴۲- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۱۶۔

۴۳- ایضاً، ص۱۸۔

44- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

45- ibid, p. 2.

۴۶- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۱۸۔

47- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 4.

۴۸- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۲۱۔

49- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 7.

۵۰- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۲۵۔

51- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 9.

۵۲- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۲۸۔

۵۳- ایضاً، ص۱۱۳۔

54- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 9,70,76.

۵۵- اسلامی فکر کی نئی تشکیل، ص۲۹۔

56- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 9.

۵۷- محمد سمیع الحق، ڈاکٹر، دیباچہ، تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۴ء، ص۵۔

۵۸- ایضاً، ص۵، ۶۔

59- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

۶۰- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۹۔

61- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

۶۲- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۹، ۱۰۔

63- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1,2.

۶۴- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۱۰۔

65- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 2.

۶۶- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۱۰۔

67- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 2.

۶۸- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۱۰۔

69- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 2.

۷۰- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۱۰۔

71- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 3.

۷۲- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۱۱۔

73- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 7.

۷۴- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۱۷۔

75- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

۷۶- تفکیر دینی پر تجدیدِ نظر، ص۹۔

۷۷- وحید عشرت، ڈاکٹر، تجدید فکریاتِ اسلام، ص۲۳۵۔

۷۸- ایضاً، ص۲۳۶۔

79- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

۸۰- تجدید فکریاتِ اسلام، ص۱۶۔

81- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

۸۲- تجدید فکریاتِ اسلام، ص۱۵۔

83- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 1.

۸۴- تجدید فکریاتِ اسلام، ص۱۵۔